جدید علمِ کلام

دوسری قسط

مولانا محمد اسحاق مصباحی

جب علم کلام کا دوسرا دور شروع ہوا، یعنی فلسفۂ یونان کے منتقل ہونے کے بعد اس وقت سے علم کلام کے مباحث کی ابتدا "موجود" کے احوال سے شروع ہوئی اور اس طرح ہم جن چیزوں کو دیکھتے ہیں اور احساس کرتے ہیں وہ اشیا اپنا ایک وجود اور حقیقت رکھتی ہیں اور انسان کو ان کا علم حاصل ہے اور وہ علم واقع اور حقیقت کے مطابق ہے۔ لہٰذا عقل انسانی عالم کے موجودات کو عرض اور جوہر میں منقسم سمجھتی ہے اور موجود کی یہ دونوں قسمیں عدم سے وجود میں آئی ہیں اور جب یہ عدم سے وجود میں آئی ہیں تو ان تمام ممکنات اور عدم سے موجود ہونے والی اشیا کا خالق ایسی ذات ہوگی بلکہ ہے جو ممکنات کا غیر ہے اور اس عالم کے احکام سے پاک ہے۔ اگر ممکنات کا خالق نہ مانا جائے تو ممکنات کا سلسلہ علت کی تلاش میں ایک غیر متناہی سلسلہ پر موقوف ہوگا اور یہ محال ہے۔

اور وہ ذات جو خالق ہے، واجب الوجود ہے، قدیم ہے، ارادۂ قدرت سے متصف ہے، واحد ہے، عالم ہے، مشیت والی ہے، یعنی اس کی کچھ صفات ثبوتیہ ہیں اور کچھ صفات سلبیہ ہیں۔ یعنی کچھ صفات سے موصوف ہونا ضروری ہے اور کچھ سے پاک ہونا ضروری ہے۔

یہاں تک یہ مندرجہ ذیل مباحث ذکر ہوتے ہیں:

اشیا کے حقائق ثابت ہیں۔ انسان کی نظر اور فہم درست ہے۔ ممکنات کا سلسلہ انتہا والا ہے اور یہ عالم حادث ہے، قدیم نہیں ہے۔ قدیم فلاسفہ کا ایک گروہ ان قواعد کے خلاف تھا۔ کچھ حقائق کو سراب اور خیال کہتے تھے اور کچھ حقائق کو اپنی نظر اور سوچ کے تابع کہتے تھے اور نظر و عقل کے فیصلہ کو غیر یقینی کہتے تھے اور کچھ نظر و عقل سے درست علم حاصل ہونے کے منکر تھے۔ ان کو عندیہ، عنادیہ اور لا ادریہ کے نام سے متکلمین نے ذکر کیا ہے۔ اور کچھ عالم کو قدیم کہتے تھے اور کچھ مادہ اور مقدار و صورت کو قدیم کہتے تھے۔

موجودہ دور میں عندیہ فرقہ کے نظریات کا تو ذکر نہیں ملتا، البتہ دو گروہ سائنس داں حضرات میں مشہور ہیں۔ آج کا ایک گروہ غیر یقینیت کا قائل ہے، یعنی وہ عقل اور نظر کے فیصلے کو مانتا تو ہے مگر وہ اس کو حتمی نہیں مانتا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم عقل کے فیصلہ کو آخری صدق اور یقین نہیں کہہ سکتے ہیں، اس لیے کہ گزشتہ صدیوں کے فیصلوں کے خلاف آج کے تجربات ہیں اور ہو سکتا ہے کہ آج کے فیصلوں کے خلاف کل کے تجربات ہوں۔

اور ایک دوسرا گروہ عالم کے قدیم ہونے کا آج بھی قائل ہے۔ ان لوگوں میں کچھ تو مدبر عالم کے وجود کے قائل ہیں اور کچھ نہیں۔ اصل میں اسلام کے علاوہ مذاہب اور نظریات خالقِ کائنات اور انسان کے علم کے تعلق سے ایک تاریک راستے میں گم ہیں۔ جب ہم ان لوگوں کے اقوال اور خیالات کو جمع کر کے دیکھتے ہیں تو اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ یہ کسی نور کی تلاش میں ہیں جو ان کو تاریکیوں سے نکال سکے۔ اسی لیے مومن کا ایمان اس دنیا میں ایک مینارۂ نور رہے۔

اقبالؔ کہتے ہیں ؎

گماں آباد دنیا میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

تو جو لوگ غیر یقینیت کے قائل ہیں وہ اگرچہ "لاادریہ" کے ہی قریب ہیں، مگر جدید دور میں فلاسفہ نے اس پر بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ لوگ اس نظریہ کا موجد مشہور جرمن ریاضی داں ورنر ہاسن برگ (م: ۱۹۲۶ء) کو مانتے ہیں، حالاں کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ یونان میں بھی عندیہ، لاادریہ اور عنادیہ مذہب کے ماننے والے فلاسفہ موجود تھے۔

اس نظریہ کے متعدد پہلو ہیں:

۱. ہم نے جس شے کو جیسا تصور کیا ہے وہ اس کے خلاف ہو سکتی ہے۔
۲. کائنات کے موجودہ نظام کو سمجھنا مشکل ہے تو آئندہ کے تعلق سے بھی کوئی نظریہ پیش نہیں کیا جا سکتا ہے۔
۳. تمام فزیکلی تجربات حتمی نہیں ہیں۔

اس نظریہ کو اگر ہم فزکس (Physics) یعنی طبیعیات سے آگے بڑھاتے ہیں تو یہ نظریہ اسلام کے عقائد کے خلاف ہے اور جتنی چیزیں بھی ایمان کا جز ہیں، جیسے جنت، دوزخ، حساب، حشر و نشر، ان سب کے ایمان کے خلاف ہے۔

اب اس نظریہ کے علمی رد کا طریقہ یہ ہے کہ کائنات میں اس کے قائل کم از کم اپنے وجود پر تو یقین رکھتے ہیں اور اپنے اس غیر یقینیت کے فیصلے اور حکم پر تصدیق کرتے ہیں تو دو چیزوں پر وہ کم از کم یقین کے قائل ہوئے، لہٰذا ہم بھی ایمان کے سلسلے میں کچھ امور پر یقینیت کے قائل ہیں تو آپ کو اعتراض کیوں؟

ہاں! اگر اس نظریہ کو صرف فزکس کے تجربات پر محدود رکھا جائے اور یہ کہا جائے کہ اشیاے مادیہ کی تحلیل، ترکیب، انفعال، تاثر، تاثیر، ری ایکشن، عناصر کی مقدار، حقائق، افعال اور خاصیات کے تعلق سے تجربات حتمی نہیں ہیں تو پھر اس نظریہ کا کوئی ٹکراؤ اسلام سے نہیں ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ انسان کو درجہ بہ درجہ علم دیتا ہے اور یہی اس کی عادتِ کریمہ ہے اور علم انسان کے لیے دیا ہوا ہے، پھر بھی یہ علم کائنات کے رازوں کو جاننے کے لیے کافی نہیں ہے۔

وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا۔

تعیین مقصد حیات

جو لوگ خالق کائنات کے قائل نہیں ہیں ان کے نزدیک یہ حیاتِ انسانی کسی مقصد کے تحت نہیں ہے بلکہ کل کائنات اور اس میں رہنے والے جان دار کسی مقصد کے لیے نہیں ہیں۔ اور یہ گروہ روح کا بھی قائل نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی خلیے کے مرکز میں ۴۶ / کروموسومز ہوتے ہیں اور ان میں مشمول جین ڈی. این. اے. کو لیے ہوتے ہیں۔ اس کی چار حرفی زبان اگلے خلیے کو منتقل ہوتی ہے اور یہ چکر حیات کہلاتا ہے اور یہ چکر تمام جان داروں میں ایک سرکل مشین کی طرح کام کرتا ہے، لہٰذا ہر ایک جان دار صرف ایک مشین ہے، اس کا کوئی مقصد نہیں، اس میں کوئی روح نہیں، اس کا کوئی خالق نہیں۔

اس مذہب کا علمی رد یہ ہے کہ جان داروں میں کروموسومز اور D.N.A. کا نظام اس مادّہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نظام کا وجود نہ تو روح کے وجود کے منافی ہے اور نہ ہی اس کے عدم کو مستلزم۔ لہٰذا اس سے روح اور مقصد کی نفی کرنا ایک دعویٰ بلا دلیل ہے اور خواہ مخواہ کا مکابرہ ہے۔ اس مذہب اور نظریہ کو آج کے دہریے اور منکرینِ خدا بہت زور و شور سے بیان کرتے ہیں۔ یہ نظریہ مسلمانوں کے ایمان کے لیے نہایت خطرناک ہے۔ جو لوگ اس کے قائل ہیں ان پر خالق کے انکار کے ساتھ ساتھ تمام احکاماتِ ایمان و اسلام کا انکار بھی لازم آتا ہے۔ اس نظریہ کو آج کل سائنس کے نقاب میں ملحد بہت توجہ دے کر پڑھاتے ہیں تا کہ اہلِ ایمان کا ایمان اور عقیدہ سلب کر سکیں۔

اعتراف، خالق کائنات کے بعد

جو مذاہب اور نظریات بَارِی تعالیٰ کے خالق ہونے اور موجود اول ہونے پر یقین رکھتے ہیں، ان میں اور اسلام کے عقائد میں فرق ہے، اس کی تفصیل میں بہت فرق ہے، لیکن بعض مذاہبِ ریاضت بھی عالم کے قدیم ہونے کے قائل ہیں۔ اسلامی عقیدہ میں رب تعالیٰ کی صفات وجودیہ یہ ہیں:

وجودِ ذاتی، قِدمِ ذاتی، وحدت، حیات، ازلیت و ابدیت، علم، قدرت، ارادہ، مشیت، تکوین، سمع و بصر۔

اور کچھ صفات سلبیہ ہیں یعنی بعض ایسی چیزیں ہیں کہ ان سے پاک ماننا ضروری ہے۔ وہ حادث نہیں، اس کے لیے فنا نہیں، اس کے لیے زمان و مکان کا ثبوت محال ہے، حیز اور جہت اس کے لیے محال ہے، اس کا کسی شکل و صورت پر ہونا محال، اس کا کسی مخلوق میں حلول کرنا، اوتار بننا محال۔ غرض وہ ان تمام چیزوں اور عیوب سے پاک ہے جو اس کے صفاتِ وجودیہ کے منافی اور متصادم ہیں۔

یہاں پر بعض مذاہب اسلامی عقیدہ کے خلاف ہیں، مثلاً جو مذاہب اس عالم کو قدیم کہتے ہیں، یا جو اس کے لیے اعضا ثابت کرتے ہیں، یا جو اس کی شکل ثابت کرتے ہیں، یا جو واجب کے کسی مخلوق میں حلول و سرایت کرنے کے قائل ہیں یا جو خالق کائنات کے کسی مخلوق کی صورت میں جنم لینے کے قائل ہیں:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ۝
وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝

بعض اسلامی عبارتوں میں ایسے الفاظ کا ذکر ہے جن سے بظاہر یہ دلالت ہوتی ہے کہ خالقِ کائنات کے لیے ید، جہت، ساق اور نزول ثابت ہے۔ مگر دوسری آیتوں میں ان چیزوں کی نفی بھی ہے۔ تو پہلی قسم کی آیتوں اور احادیث کو "متشابہات" کہا جاتا ہے، ان پر صرف ایمان لانا واجب ہے اور ان کی حقیقت کی تلاش منع۔ بلکہ ان کا ذکر اور

نزول اسی لیے ہوا کہ ایمان والوں اور عقل پرستوں میں امتیاز رہے۔

باریِ تعالیٰ کی صفات کے سلسلے میں معتزلہ اور اہلِ سنت کا مشہور تنازع رہا ہے اور وہ مسئلۂ صفات ہے۔ معتزلہ واجب کی صفات کو عین کہتے ہیں اور اہلِ سنت ان صفات کو نہ عین کہتے ہیں اور نہ غیر۔ اصل میں اہلِ سنت واجب تعالیٰ کی اکثر صفات میں شرع کے بیان سے آگے نہیں جاتے اور معتزلہ فلسفیوں کی طرح عقلی تحقیق سے حل کرنا چاہتے ہیں اور وہ صفات واجب کو قدیم کہنے سے ڈرتے ہوئے حقیقت میں ان کی نفی کرتے ہیں۔

قدیم ہندوستانی مذاہب میں آریوں میں چند لوگ حلول کے قائل نہیں ہیں اور وہ واجب وخالق کو نرنکار (निरंकार) مانتے ہیں اور بت پرستی کے خلاف ہیں مگر وہ چوں کہ نبوتِ محمدی کے قائل نہیں لہٰذا وہ یوں اسلام کے عقیدہ سے الگ ہیں، باقی اور ہندوستانی مذاہب جیسے جین مذہب اور بودھ مذہب، تو یہ روحانیت کے نظام کے ساتھ ساتھ نبوت اور واجب کے وجود کے قائل نہیں ہیں۔ اس کے برعکس سناتن دھرم کے لوگ حلول اور واجب کے مخلوق کی شکل میں جنم لینے کے قائل ہیں۔ اسی لیے ان مذاہب کے بانیوں کو اہلِ اسلام نبی اور پیغمبر نہیں کہتے اور ان مذاہب کے مآخذ بھی تاریخی اعتبار سے مشکوک ہیں۔ ان کے پاس عقائد کی تفصیل بھی نہیں۔ بودھ اور جین مذہب میں اول تاملِ نفسی کا قائل ہے اور دوسرا فطرت کے اصول کا، یہ مذاہب تمام عقائد اور سیاسی نظام سے بحث نہیں کرتے۔

تشریحات واجب تعالیٰ

اہلِ سنت کا اتفاق ہے کہ خالقِ کائنات عیوب سے پاک ہے اور ان عیوب میں کذب بھی ہے لہٰذا وہ اس سے بھی پاک ہے۔ یعنی اس کی قدرت کذب کو شامل نہیں ہے۔ اسی طرح وہ امور جو اس کے وجوبِ ذاتی کے خلاف ہیں جیسے خود کو فنا کرنا، وہ ان تمام امور سے پاک ہے اور اس کی قدرت ان محالات پر شمول نہیں رکھتی۔

قال فی النبراس:"أما عدم القدرة علی المحال فلیس بنقصان لأن تعلق الارادةبہ محال فلا عجز و قال بعض الاکابر بل ھذا نقص فی المحل حیث لم یستعد لتعلق القدر بہ. (النبراس،ص:۱۲۳)

(ترجمہ) اب قدرت کا تعلق محال سے نہ ہونا تو یہ قدرت کے لیے کمی اور عیب نہیں ہے۔ اس لیے اس محال سے ارادہ کا تعلق محال ہے تو عاجز ہونا لازم نہیں۔ بعض بڑے ائمہ نے فرمایا کہ یہ محل میں کمی ہے کہ وہ قدرت وارادہ کے تعلق کے لائق صلاحیت نہیں رکھتا۔

موجودہ دور میں دیوبندی فرقہ اس بات کا قائل ہے کہ خالقِ کائنات کے لیے کذب محال نہیں بلکہ ممکن ہے۔ ان کے مولوی رشید احمد نے واجب تعالیٰ کے لیے کذب بالفعل مانا۔ امام احمد رضا خاں نے ان کے اس عقیدہ کا رد فرمایا۔ ان کی کتاب: "سبحان السبوح" بہت مشہور ہے۔ اصل میں یہاں یہ بات بتانا ضروری ہے کہ دیوبندی اور وہابی حضرات کے جو چند مشہور عقائد ہیں وہ اس وقت سامنے کیوں آئے؟ ان کے عقائد یہ ہیں:

۱. علم غیبِ ذاتی اور عطائی دونوں قسم اللہ کے نبی کے لیے محال ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ)

۲. اللہ تعالیٰ بالفعل کذب بول چکا ہے۔

۳. سرکار دوعالم ﷺ کے بعد اگر کوئی نبی آئے تو خاتمیتِ محمدی میں فرق نہیں پڑے گا۔ (تحذیر الناس)

۴. بندوں کو بعد مرگ یا دور سے پکارنا شرک ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ)

بیسویں صدی کے شروع سے عالمِ اسلام سخت پریشانیوں کا سامنا کر رہا تھا اور اس پر علمی اور سیاسی جنگیں مسلط تھیں۔ ان عقائد جیسے اعتراضات ان پر یورپ کی طرف سے ہو رہے تھے۔ یورپ سے مستشرقین یہ کوشش کر رہے تھے کہ ثابت کر دیں کہ دوسرے نبی کا آنا اسلام میں ممکن ہے اور قرآن میں کذب ہے۔ اور عام امتِ مسلمہ بھی دوسرے شرک کے مذاہب کی طرح شرک میں آلودہ ہے۔ یہ سب مستشرقین عیسائیوں اور یہودیوں کی کوشش تھی اور یہی سب کچھ دیوبندیوں کی زبان پر تھا اور اب تک ہے۔ اسی بات سے اس شبہہ کو تقویت ملتی ہے کہ دیوبندی، وہابی اور قادیانی تحریک اپنے اصلی لباس میں ایک ہیں اور تینوں کی تعلیم کا سرچشمہ یہودی اور کیتھولک تشدد پسند عیسائیوں کی دین ہے، ورنہ وہ وقت ان مسائل کی بحث کا تھا ہی نہیں۔

یہودی یہی کوشش کر رہے تھے کہ مسلمانوں کے دلوں سے محبتِ رسول ﷺ نکال دیں۔ اس کے لیے ان کو تلاش تھی کسی مدعیِ نبوت کی اور چوں کہ قرآن پاک میں سرکارِ دوعالم ﷺ کو خاتم النبیین فرمایا جا چکا تھا۔ اس لیے نئے مدعیِ نبوت کے لانے کے لیے دو ہی راستے تھے، یا تو خدائے تعالیٰ کو جھوٹا کہہ دیا جائے یا آیت کے معنیٰ میں ایسی تاویل کی جائے کہ ـــــ

(باقی، ص:۲۱ پر)